مولانا محمد حنیف ندوی

ایک آیت

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (البقرہ: ۲۵۱)

ترجمہ: اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے حملوں سے بچاؤ اور دفاع کی صورت پیدا نہ کرتا، تو روئے زمین تباہ ہو کر رہ جاتی۔ یہ تو ساری کائنات پر اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے یہ صورت پیدا نہیں ہونے دی۔

مغرب کے شبیدہ طراز دانشوروں کی جادوگری دیکھیے کہ ان کی اپنی پوری تاریخ تو معرکہ آرائیوں سے آراستہ ہے لیکن اقوام مشرق کو بتایا یہ جا رہا ہے کہ لڑائی ایک برائی ہے، جہاد اور دفاع کے تقاضے محض حیوانی جبلت کا کرشمہ ہیں، اور یہ کہ جنگ اور جہاد کی کوششوں کا روحانیت اور دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی نہیں، بلکہ جب کسی شخص یا معاشرہ میں یہ جذبہ ابھرتا ہے تو اس سے دین کی روحانی قدروں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور مذہب و دین اعلیٰ اور فائق تر تہذیب کے دائروں سے نکل کر اس دائرے میں داخل ہو جاتا ہے جس کا تعلق جسم سے ہے، سیاست سے ہے، استعمار اور دھاندلی سے ہے، دین، روح اور قلب و ذہن کے لطیف داعیوں سے نہیں!

اس یقین دہانی کو اس تواتر، اس ترتیب اور ہشیاری سے پیش کیا گیا اور مختلف مناسبتوں سے ادب، مذہب، تاریخ اور تہذیب و تمدن سے متعلقہ نظریات کے سلسلے میں اس کو دہرایا اور بار بار اگلا گیا ہے کہ سادہ لوحانِ مشرق کو بھی ماننا پڑا ہے کہ لڑائی، جنگ اور جہاد چاہے کتنے ہی بلند مقاصد رکھتے ہوں، بہرحال ایک برائی ہے جس کو گوارا تو کیا جا سکتا ہے اور بعض ناگزیر حالات میں اس کے جواز پر بھی مہر تصدیق ثبت کی جا سکتی ہے، مگر کسی بھی صورت میں اس کو نیکی، معروف اور اعلیٰ انسانی قدر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اور اسی پروپیگنڈے کا یہ اثر ہے کہ خود ہمارے ہاں جہاد کو ایک عبادت رضائے الٰہی کے حصول کا ایک ذریعہ اور اعلیٰ تخلیقی اور روحانی داعیہ کے بجائے محض دفاع کا ایک انداز سمجھا جانے لگا اور بعض جدید نوع کے مفسرین مجبور ہو گئے کہ جب بھی اس کا ذکر کریں، شرما کر، اور معذرت

خواہانہ انداز میں کریں۔ گویا یہ ایک غلطی تھی جس کا ازالہ ہونا چاہیئے۔ قرآن حکیم کی اس مختصر ترین آیت میں جس حکمت بالغہ، جس فلسفہ حیات اور تعمیر وارتقا کی جس بنیاد اور اساس کی نشان دہی کی گئی ہے، وہ اس مرعوبیت کی تردید کے لیے برہان قاطع کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو علم الحیات اور تاریخ کے حوالے سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ دفاع وجہاد کیوں ضروری ہے۔ کیوں ایک ناگزیر انسانی فریضہ ہے اور اس کے نتائج کس درجہ تعمیری اور تخلیقی نوعیت کے حامل ہیں؟

سوچنے کی چیز یہ ہے کہ کیا انسان میں خواہشات وجذبات، اغراض ومقاصد، اقدار اور اصولوں کا اختلاف ہمیشہ سے رونما نہیں ہے اور کیا تاریخ کا کوئی دور ایسا فرض کیا جا سکتا ہے کہ جس میں خیر وشر اور حق وباطل کے درمیان معرکہ آرائی معرض وجود میں نہ آئی ہو۔ اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اور حفظ و بقائے ذات کا تقاضا دراصل وہ حیاتیاتی تقاضا ہے جس سے انسان تو انسان، ادنے درجے کا حیوان بھی محروم نہیں رکھا گیا۔ اور یہی وہ حیاتی تقاضا ہے جس نے زندگی کے قافلہ کو آگے بڑھایا اور ہست وبود کے کارخانہ کو ترقی دی ہے۔ اور یہی حیاتیاتی داعیہ جب انسانی فطرت کا جزو بن جاتا ہے تو اس کی یہ جنگ قومی اور فکری تشخص کی بقا واحیا کی ضامن قرار پاتی ہے۔ یہ جنگ اس صورت میں ادنیٰ خواہشات کے دائرے سے نکل کر قدروں اور اصولوں کے وسیع تر دائرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ لڑنے، مرنے مارنے اور غلط اور مخالف قوتوں کی مخالفت وعناد کا یہ جذبہ اگر حیوانات علاوہ انسانوں میں پایا نہ جاتا تو ہست وزیست کی یہ شمع جو آج روشن اور ضیا افروز نظر آتی ہے کبھی کی بجھ گئی ہوتی اور یہ معمورۂ حیات خرابہ میں بدل چکا ہوتا۔

تاریخ کے دروازہ پر دستک دیجیے تو آپ کو کوئی معاشرہ ایسا نہیں ملے گا جس نے اپنے حقوق، اپنی ثقافت اور روایات کے تحفظ کی خاطر نبرد آزمائی نہ کی ہو۔ ہر قوم کی زندگی میں ایسے موڑ ضرور آتے ہیں، جہاں دوسروں سے تصادم رونما ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو محبت اور پیار کو انسان دوستی اور روحانی قدروں کو بہت اہمیت دیتے چلے آئے ہیں، اکثر مجبور ہو گئے ہیں کہ میدانِ کارزار میں نکلیں اور داد شجاعت دیں۔ یہی نہیں۔ تاریخ کا یہ تجربہ ملاحظہ ہو کہ اسلام جو دفاع وجہاد کو بہترین انسانی اور روحانی نصب العین ٹھہراتا ہے، جب بھی لڑا ہے تو اس نے اس لڑائی میں اخلاقی وروحانی پابندیوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا اور انسان دوستی کے ایسے ایسے نمونے پیش کیے ہیں جس پہ دنیا محو حیرت ہے [illegible] جو بجائے خود عالمگیر انسان دوستی کی حامی وناصر رہی ہیں جب بھی اپنوں اور دوسروں

پنجہ آزما ہوئی ہیں، انھوں نے تمام انسانی قدروں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے، اور ایسی بربریت، ظلم اور قساوتِ قلبی کا مظاہرہ کیا ہے جس سے خود انسانیت شرمندہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ بات یہ ہے کہ فطرت کا ہر داعیہ، تہذیب، اصلاح اور تعمیر و تربیت کا مخصوص سانچہ چاہتا ہے جو اس داعیہ کے حدود متعین کرے، اس کے لیے ان کے اخلاق وضع کرے۔ اس کی روح اور فلسفہ کو نکھارے اور اس کو ایسی شکل میں ڈھالے جو فرد و معاشرہ دونوں کے لیے باعث برکت و سعادت ہو۔ بعینہٖ یہی معاملہ جہاد و دفاع کے جذبہ و داعیہ کا ہے۔ اسلام نے اس کو پیدا نہیں کیا، نہ از سرِ نو اس کی طرح ہی ڈالی ہے بلکہ صرف اس کے حدود و آداب کا تعین کر دیا ہے، اس کی شرائط واضح کر دی ہیں اور اس کو ایک فرد کی خواہشات یا ایک معاشرہ کے جوانی تقاضوں سے نکال کر عبادت، ایثار اور محبت و رضوان الٰہی کے فرازوں تک اچھال دیا ہے۔ اس کو ایک طرح کی پاکیزگی عطا کی ہے، تقدس کا پیرہن بخشا ہے اور ایک ایسا مسلّمہ بنا دیا ہے کہ جس سے پوری نوعِ انسانی کا تہذیبی و روحانی ورثہ محفوظ ہو کر رہ گیا ہے، یعنی اسی سے انسانوں میں باہمی تہذیبی و اجتماعی رشتوں کے بارے میں احترام و توقیر کا جذبہ پیدا ہوا ہے، اور قرآن کی رُو سے اگر تاریخ میں اس عمل کو کسی نہ کسی صورت میں دہرایا نہ جاتا، تو پورا انسانی معاشرہ بگاڑ کا شکار ہو جاتا۔ اسی مفہوم کو سورہ الحج، ۴۰ میں اس طرح بیان فرمایا کہ اگر حقوق و فرائض کی یہ لڑائیاں نہ لڑی جائیں اور اللہ تعالیٰ کے جانباز سپاہی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے حمایتِ حق کے مراحب سے عہدہ برآ نہ ہوتے تو یہودیت باقی رہتی نہ عیسائیوں کا پیغام سنائی دیتا اور نہ وہ مسجدیں تباہی و ہلاکت سے محفوظ رہ پائیں جو ذکرِ الٰہی کا سرچشمہ اور مرکز ہیں۔ گویا یہ مسلمانوں کا جذبہ جہاد ہی تھا جس نے نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ پوری دنیائے انسانیت پر احسانِ عظیم فرمایا۔ ورنہ اگر ظالموں لٹیروں اور حرص و آز کے درندوں کو پوری پوری آزادی دی جاتی تو آج دنیا کے نقشہ پر تہذیب و تمدن کے یہ نقوش فروزاں نہ ہوتے۔

خدا کی راہ میں مٹ مرنے اور کسی روحانی سچائی کے لیے جان کی بازی لگا دینے میں کیا روحانی لطف و لذت پنہاں ہے اور اس سے رضائے الٰہی کے کون کون سے دریچے وا ہوتے ہیں۔ اس سے قطع نظر جہاد و دفاع کا یہ فائدہ کیا کم ہے کہ اس سے انسان کے اندر بہادری، احترامِ حق، احساسِ ذمہ داری، ایثار، جاں نثاری اور اخلاص کے ایسے اعلیٰ جذبے اور فائق تر داعیے جنم لیتے ہیں جن کے بل پر کوئی قوم دنیا کی بہترین قوم کہلانے کا استحقاق حاصل کرتی ہے۔